ان کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے آپ کے والد شہاب الدین اپنے زمانے کے مشہور عالم و محدث ہیں۔ ابن تیمیہ نہ تو آپ کی کنیت ہے اور نہ لقب۔ بلکہ آپ کے خاندان کے ہر فرد کو ابن تیمیہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے ابن خلکان نے ابوالبرکات المستوفی سے روایت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب آپ کے پردادا ابوالقاسم الخضر کے بڑے صاحبزادے فخرالدین محمد الخطیب ۶۰۴ھ میں حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو دوران سفر آپ کا قیام راول کے قریہ میں ہوا، جہاں ابن المستوفی نے آپ سے اس نام کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ آپ نے بتایا کہ جب ان کے نانا حج کو جارہے تھے تو ان کا گذر تبوک کے ایک گاؤں یتماء سے ہوا، جہاں انہوں نے ایک چھوٹی خوبصورت بچی دیکھی۔ جب وہ حج سے واپس گھر پہنچے تو انہیں ان کی نومولود بچی کی خبر سنائی گئی۔ آپ نے اسے دیکھا تو اس کی شکل ہو بہو اس بچی سے ملتی تھی، جسے آپ نے دوران سفر یتماء میں دیکھا تھا۔ آپ بے ساختہ یا تیمیہ.... یا تیمیہ پکارنے لگے۔ چنانچہ اس کا نام ہی تیمیہ رکھ دیا گیا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے آل تیمیہ کو ابن تیمیہ کہا جانے لگا[1]۔ اکثر مورخین نے اس نام کی یہی وجہ بیان کی ہے البتہ ابن کثیر کو کچھ اختلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تیمیہ دراصل ابوالقاسم الخضر کی دادی کا نام تھا جو نہ صرف بلند پایہ عالمہ و فاضلہ تھیں بلکہ اچھی واعظہ و زاہدہ بھی تھیں۔ وہ اس قدر مشہور ہو گئیں کہ ان کے خاندان کے افراد بھی اس نام کی مناسبت سے یاد کئے جانے لگے[2]۔

خوردسالی ہی میں جہاں ایک طرف امام صاحب نے اپنے گرد و پیش علم و فضل کے سوتے پھوٹتے دیکھے، وہاں ان کی ننھی آنکھوں نے مصائب کے طوفان بھی امڈتے پائے۔ ساتویں سال میں ابھی قدم رکھا تھا کہ آپ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تاتاریوں کی آئے دن مسلمانوں کے کسی نہ کسی علاقے پر غارت گری ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ حرّان بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اہل شہر اپنی جانوں کو بچانے کی فکر میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اسی بھگدڑ میں

---

[1] i۔ ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۳۸۴۔ ii جلاء العینین صفحہ ۴
[2] ابن کثیر۔ اختصار علوم الحدیث صفحہ ۸۶

آپ کے خاندان کے افراد منتشر ہو گئے اور آپ اپنے والد کی معیت میں دمشق آ گئے۔ دمشق ان دنوں صرف شام کا مرکزی شہر ہی نہ تھا بلکہ علمی لحاظ سے بھی اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی آپ کے والد جب یہاں کے علمی حلقوں سے متعارف ہوئے تو جلد ہی انہیں ایک ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔ دمشق کی جامع اعظم میں ان کے درس ہونے لگے جن کی وجہ سے اہل علم کی کثیر تعداد ان کی مداح ہو گئی اور انہیں "دارالحدیث سکریہ" کا شیخ مقرر کر دیا گیا۔

امام ابن تیمیہ کی تعلیم کا بیشتر زمانہ دارالحدیث سکریہ سفح قاسیون کے مدرسہ ابی عمر اور مدرسۃ الحنبلیہ میں گزرا آپ کا حافظہ غضب کا تھا حدیث اور اسماء الرجال میں آپ نے چند ہی دنوں میں شہرت حاصل کر لی۔ شیوخ زمانہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سماعت حدیث و تکرار اسماء الرجال فرماتے۔ جس سے ملتے وہ حیران ہو جاتا اور آپ کے حافظہ کی داد دیئے بغیر نہ رہتا۔ ان شیوخ میں چند کا ذکر آپ نے اپنے رسالہ "اربعون حدیث" میں بھی کیا ہے طالب علمی ہی کے دور میں تبحّر علمی کی وجہ سے آپ کو فتوی دینے کی اجازت مل گئی تھی۔ بعد میں باقاعدہ فتوی کی اجازت آپ کو قاضی شیخ شرف الدین ابو العباس احمد المقدسی شافعی (المتوفی ۶۹۴ھ) نے دی، جس پر وہ خود اکثر فخر کیا کرتے تھے [۱]۔ ۳۰ ذی الحجہ ۶۸۲ھ کو آپ کے والد نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی جگہ آپ شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ ۲ محرم ۶۸۳ھ کو شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ نے پہلا درس دیا جس میں امراء وزراء قاضی علماء اور عمائدین شہر موجود تھے۔ دوران درس خود قاضی القضاۃ شہاب الدین آپ کے بیان کے دلائل نکات اور فصاحت پر انگشت بدنداں تھا۔ آپ سے درخواست کی گئی کہ جمعہ کی نماز کے بعد آپ جامع دمشق میں تفسیر قرآن بھی فرمایا کریں جسے آپ نے قبول کیا اور دس صفر ۶۸۳ھ کو آپ نے دمشق کی عظیم الشان جامع میں درس تفسیر کا آغاز فرمایا۔ کچھ ہی عرصہ بعد شیخ الحنابلہ شیخ زین الدین ابن المنبجی کا انتقال ہوا تو بالاتفاق اس وقت کا یہ بڑا علمی اعزاز بھی آپ ہی کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد آپ کو افکار کی اشاعت کا مزید موقع ملا۔ اور شب و روز مختلف الخیال

۱۔ البدایہ والنہایہ جلد ۱۳ صفحہ ۳۴۱

علماء و فقہاء سے مختلف موضوعات پر بحث و مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ اس دوران گو بااوقات آپ کو اپنے خلاف فتوے بھی سننا پڑے لیکن آپ نے کبھی ان کی پروا نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد مخالف علماء یا تو خاموش ہو گئے یا پھر آپ کے قوی استدلال کی وجہ سے آپ سے مباحثوں سے گریز کرنے لگے۔

۶۹۹ھ میں تاتاری مصر کے حاکم ناصر بن قلادون کو شکست دے کر دمشق تک پہنچ گئے۔ عوام الناس میں بھگدڑ مچ گئی۔ خود عمائدین شہر علماء اور عہدہ دار تک ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ شہر خالی ہو گیا۔ صرف قاضی القضاۃ اور چند اور ذمہ دار لوگ باقی رہ گئے امام ابن تیمیہ نے شہر نہ چھوڑا بلکہ وہ چند عہدیداروں اور معززین کا وفد لیکر تاتاری سالار قازان سے ملے۔ اور اسے اتنا متاثر کیا کہ جس قدر بھی مسلم یا غیر مسلم لوگ اس کی قید میں تھے اس نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا اور جامع دمشق کے میناروں سے امن کا پروانہ پڑھا گیا۔[۵]

دوسرے سال تاتاری پھر حملہ آور ہوئے۔ سلطان ناصر مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ تاتاری لشکر حلب تک پہنچ گیا ہے تو وہ واپس مصر چلا گیا۔ یہ صورتحال ظاہر ہے کہ دمشق والوں کے لئے کس قدر پریشان کن ہو گی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سلطان ناصر کے پاس وفد بھیجا جائے۔ امام ابن تیمیہ وفد کے قائد بن کر سلطان ناصر کے پاس پہنچے اور ان کے سمجھانے سے سلطان لشکر لیکر مقابلہ کے لئے شام کو روانہ ہو گیا۔ لیکن مقابلہ کی نوبت نہ آئی اور تاتاری سلطانی لشکر کی آمد کی خبر سنتے ہی واپس چلے گئے۔ ۷۰۲ھ میں ایک بار پھر تاتاریوں نے یلغار کی۔ اور دمشق والوں کو میدان کارزار میں کودنا پڑا۔ امام ابن تیمیہ اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ مسند تدریس اور منبر خطابت پر بیٹھنے والا یہ عالم میدان جنگ میں بھی پرسکون اور بشاش بشاش نظر آتا تھا۔ تاتاریوں نے جب دیکھا کہ اہل دمشق واقعی آخری فیصلہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں تو واپس چلے گئے۔

دور ابتلا ۔ اس کے بعد ابن تیمیہ کی زندگی میں جو موڑ آئے انہیں ان کے دور ابتلاء

---

[۵] البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۸

سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اپنے خیالات و افکار کی ترویج کی بنا پر انہیں دمشق سے مصر بلوایا گیا۔ وہاں لوگوں نے جو آپ کی نئی باتیں اور نئے افکار سنے، ایک شورش برپا کردی۔ علمار کا طبقہ الگ خلاف ہوگیا۔ قاضی الگ بگڑ گئے۔ بالآخر قاضی القضاۃ زین الدین بن مخلوف کے حکم سے آپ قید کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پہنچا دیئے گئے مہنا بن عیسیٰ ایک عرب امیر نے جو امام صاحب کا معتقد بھی تھا اور بااثر بھی۔ مصر جاکر نائب السلطنت کے ملا، اور اٹھارہ ماہ کی قید سے تیئیس ربیع الاول ۷۰۷ھ کو امام صاحب کو رہا کرایا۔ وہ آیا تو اس لئے تھا کہ رہائی کے بعد آپ کو دوبارہ دمشق لیجایا جائے لیکن آپ نے مصر ہی میں قیام کو ترجیح دی اور قاہرہ ہی کو اپنا مرکز بنایا۔ ان دنوں جہاں ایک طرف علمار نے جزئی مسائل کو عوام میں اصولی بنا کر اس قدر راسخ کردیا تھا کہ اصولی مسائل کی گو وہ پرواتک نہ کرتے تھے، تو دوسری جانب وحدۃ الوجود کے فلسفے لوگوں کے ذہنوں کو ہندی اور یونانی فلسفہ سے اس قدر قریب کردیا تھا کہ اسلامی تعلیمات کی روح ختم ہورہی تھی چنانچہ جب آپ نے علمار اور صوفیار پر نکتہ چینی شروع کردی تو مخالفت کا ایک طوفان پھر سے کھڑا ہوگیا۔ جس کی وجہ سے حکومت نے آپ کو تین شرطیں پیش کردیں۔

۱۔ یا آپ دمشق واپس چلے جائیں۔

۲۔ یا اسکندریہ میں رہیں جہاں تقریر و تحریر کی آپ پر پابندی رہے گی۔

۳۔ یا پھر جیل جانا منظور کریں۔

آپ چونکہ دمشق واپس جانا نہیں چاہتے تھے اور اسکندریہ کا مشروط قیام بھی منظور نہ تھا۔ اس لئے آپ نے حکومت کی تیسری تجویز بخوشی منظور کرلی لیکن شاگردوں اور مداحوں کا اصرار تھا کہ آپ دمشق روانہ ہوجائیں چنانچہ اٹھارہ شوال ۷۰۷ھ کو آپ نے دمشق کا سفر اختیار کیا۔ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ سرکاری ہرکارے واپس ساتھ لے گئے اور آپ کو نظر بند کردیا گیا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سلطان ناصر کی حیثیت معزولوں جیسی تھی۔ اس نظر بندی کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ "مدرسۂ صالحیہ" میں امام صاحب کے ہم خیال علمار ان کے تلامذہ اور مداحوں نے جمع ہوکر ایک قرارداد منظور کی جس کی وجہ سے آپ

نظر بندی ختم کردی گئی۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد دو صفر ۷۰۹ھ کو آپ اسکندریہ روانہ ہوئے جہاں آٹھ ماہ تک اپنے افکار کی تبلیغ کرتے رہے۔ جونہی سلطان ناصر نے دوبارہ عنان حکومت سنبھالی سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ آپ کو واپس قاہرہ بلا لیا۔ قاہرہ آتے ہی آپ کی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں۔ اور آپ ابن عربی، ابن عطاء اللہ الاسکندری اور ابن فارض پر ان کے فلسفہ وحدۃ الوجود کی وجہ سے نکتہ چینی کرنے لگے۔ علم کلام کے مختلف مسائل پر علماء سے پہلے ہی ٹھنی ہوئی تھی۔ اب کی بار سب علماء نے متفق ہوکر حکومت کی توجہ آپ کی طرف مبذول کرائی چنانچہ مالکی، حنبلی، شافعی اور حنفی علماء قاضیوں اور نائب السلطنت پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے آپ کو ایک قلعہ میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کردیا جہاں بائیس رجب ۷۲۰ھ سے دس محرم ۷۲۱ھ تک تقریباً اٹھارہ ماہ نظر بند رہے۔

امام صاحب کی زندگی کے ان مختلف حالات سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا پہلا دور تعلیم و تحقیق کا ہے۔ دوسرے دور میں وہ مسند تدریس پر متمکن نظر آتے ہیں۔ اور ساتھ ہی قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے افکار و عقائد کی اشاعت کرتے ہیں۔ تیسرے دور میں وہ کہیں میدان کارزار میں کہیں سیاسی گتھیوں کے سلجھانے اور کہیں علم کلام کے مسائل پر مناظروں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کا چوتھا دور وہ ہے جب وہ مناظروں کے بجائے اپنے افکار کی مجتہدانہ تشریح کرتے ہیں اور انہیں تقریر و تحریر کے ذریعہ پھیلاتے ہیں۔ مسند تدریس ہو یا جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری، وہ کسی طرح بھی حالات سے شکست تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ ۷۲۱ھ کی رہائی کے بعد دمشق آکر اسی جوش و خروش سے وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے، جس کے نتیجہ میں ۷، شعبان ۷۲۶ھ کو پھر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ان کی مصروفیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ برابر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ مقصد تو تقریر و تحریر پر پابندی تھا۔ اس طرح تقریر کا تو امکان نہ رہا۔ لیکن تحریر میں جیل کی چار دیواری ہرگز مانع نہ تھی آخر ۹ جمادی الاخر ۷۲۸ھ کو تحریر و مطالعہ کا سب سامان آپ سے لے لیا گیا۔ اس مدت میں لکھے ہوئے ساٹھ مجلدات اور چودہ نامکمل فائل کتب خانہ عادلیہ میں جمع کردیئے گئے۔ بے سروسامانی کے بعد اپنی مہم کی لگن

کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ ردی کا غذوں پر کوئلہ سے آپ نے لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ بے سروسامانی اور مجبوری کی زندگی زیادہ عرصہ نہ گزر سکی اور آپ بیمار ہو گئے بیس روز بیمار رہنے کے بعد پانچ ماہ کی مسلسل قید برداشت کرتے ہوئے اسلام کا یہ بطل جلیل بیس ذوالقعدہ ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۷ء راہی ملک بقا ہوا۔ جیل کے مینارہ سے وفات کی منادی کر دی گئی شہر میں کہرام مچ گیا اپنے پرائے سبھی اشک بار تھے۔ نماز جنازہ میں شرکت کے لئے سارا شہر امڈ آیا۔ لوگوں کے جمع غفیر کی وجہ سے تین جگہ نماز جنازہ ہوئی پہلی نماز جنازہ قلعہ ہی میں کرائی گئی جس کی امامت شیخ محمد بن تمام نے کی۔ پھر آپ کا جنازہ جامع دمشق میں رکھا گیا جہاں شیخ علاؤ الدین بن الخراط نے امامت کی۔ پھر بھی بہت سے لوگ رہ گئے تو کھلے میدان میں علامہ زین الدین عبدالرحمٰن کی امامت میں نماز جنازہ ہوئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دو لاکھ مردوں اور پندرہ ہزار عورتوں نے آپ کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ آخری آرام گاہ کے لئے آپ کے آبائی قبرستان مقابر صوفیہ کو منتخب کیا گیا جہاں آپ کے بھائی شرف الدین عبداللہ کے پہلو میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

افکار

• امام صاحب کے انقلابی افکار کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ ان اسباب وعلل کا جائزہ لیا جائے جن میں آپ کے خیالات کی نشو ونما ہوئی آپ نے جب ہوش سنبھالا تو زندگی کا پہلا تجربہ یا سانحہ حران سے دمشق کو "نقل مکانی تھا" سات ہی سال کی عمر میں آپ نے تاتاری بربریت کے مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ دمشق پہنچے اور تحصیل علم کے بعد جب آپ نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو خیالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو مختلف فقہی اور کلامی گروہ بندیوں میں بندھا پایا۔ علمی دنیا میں آپ نے دیکھا کہ ایک گروہ تو وہ ہے جو کسی خاص فقہی مسلک سے وابستہ ہے اس سے باہر وہ کسی فکر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جو فیصلے قدما نے کر دیئے وہ حرف آخر بن گئے۔ اس کورانہ تقلید کی وجہ سے بسا اوقات مختلف فقہی مسالک کی خود آپس میں ٹھن جاتی تھی اور نتیجہ ایک دوسرے کے

خلاف فتووں اور مناظروں کی صورت میں نکلتا تھا۔ اس کے برعکس کچھ لوگ محض یونانی فلسفہ پر اکتفا کر بیٹھتے تھے۔ یونانی فلاسفہ کے وضع کردہ تیغوں پر اسلامی عقائد کو تولنے کی کوششیں کی جاتی تھیں اور علم کلام میں ایسی بحثوں کا آغاز کیا جارہا تھا جو یونانی فکر کو اسلام میں مدغم کرنے کے مترادف تھیں ایک تیسرا گروہ بھی تھا۔ جو ان دونوں قسم کے لوگوں سے ہٹ کر فلسفہ و مذہب میں ربط پیدا کر رہا تھا۔ اخوان الصفا کے مصنفین و "فصل المقال فیما بین الشریعۃ والفلسفۃ من الاتصال" جیسی کتب اس کی بہترین مثال ہیں۔ چوتھے گروہ میں علم کلام کے مختلف الخیال طبقے شامل کئے جا سکتے ہیں۔ امام ابوالحسن کے پیرو اشاعرہ اور امام ابو المنصور کے متبع ماتریدی، جبریہ یا جہمیہ اور معتزلہ خیالات کے باعث خواص و عوام میں عقائد کی بحث جاری رہتی تھی۔ خوارج اور شیعہ فرقوں کا شور الگ بپا تھا۔ خود شیعہ فرقوں ہی میں باہمی مناظروں کا بازار گرم رہتا۔ بلاد اسلامیہ کے وہ عیسائی جو بظاہر کچھ نہ کہتے تھے لیکن اندرونی طور پر اسلام اور پیغمبر اسلام پر رکیک حملے کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تھے۔ خواص و عوام پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ یونانی فلاسفہ سے متاثر ہو کر یہ رجحان عام ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص صفائے نفس سے روحانی قوت کی ایک منزل پر پہنچ جائے تو خدا اس میں حلول کر لیتا ہے یہ نظریہ بھی عام تھا کہ خالق اور مخلوق شوق اور محبت کی وجہ سے ایک ہیں۔ محبت ہی وہ ذریعہ ہے جس کی بدولت انسان کی فانی ذات خدا کی باقی ذات میں فنا ہو جاتی ہے، جسے متصوفین کی اصطلاح میں محو اور محسوسات سے لاتعلق ہو جانے کو "سکر" کہا جاتا تھا۔ اتحاد۔ حلول اور شہود کے ان نظریات سے اوامر و نواہی اور جزا و سزا کی اسلامی تعلیمات متاثر ہو رہی تھیں۔ فتوحات مکیہ میں ابن عربی کے یہ ابتدائی اشعار امام ابن تیمیہ کے نزدیک انسان کو تکالیف شرعی سے بے نیاز کرنے کے مترادف ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ۔

الرب حق والعبد حق　　　یا لیت شعری من المکلف

ان قلت عبد فذاک رب　　　او قلت رب انی یکلف

"رب بھی خدا ہے اور بندہ بھی خدا ہے پھر مکلف کون رہا؟ کوئی بھی نہیں! اگر تم کہتے ہو "عبد" تو وہی "رب" بھی ہے۔ جسے تم "رب" کہتے ہو وہ مکلف کیسے ہو جائیگا"

امام صاحب ابن عربی کے ان اشعار کو بھی ایمان بالآخرت اور جزا و سزا کے سلسلہ

میں خلاف اسلام تصور کرتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ؎

فلم یبق الاصادق الوعد وحدہ وبالوعید الحق عین تعاین

وان دخلوا دار الشقاء فانھم علی لذۃ فیھا نعیم یباین

" کوئی بھی باقی نہیں رہے گا مگر صرف صادق الوعد اور آنکھ اللہ کی وعید کو دیکھ لے گی اور اگر لوگ جہنم میں داخل کیے گئے تو اس میں بھی لذت اور لطف پائیں گے "

حسین بن منصور حلاج نے لوگوں کو برملا اس فکر کی دعوت دی ؎

سبحان من أظھر ناسوتہ سر سنا لاھوتہ الثاقب

ثم بدا فی خلقہ ظاھرا فی صورۃ الآکل والشارب

حتی لقد عاینہ خلقہ کلحظۃ الحاجب بالحاجب

" کیا پاک ہے وہ ذات جس نے ناسوت میں اپنے چمکتے ہوئے لاہوت کو ظاہر کیا پھر اپنی مخلوق میں کھانے پینے والوں کی شکل میں ظاہر ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے صاف صاف اس کا معائنہ کر لیا "

(تاریخ بغداد۔ ج۔ ۸ ص ۱۲۹)

ابن فارض کے افکار کی اشاعت سے لوگوں کی زبان پر اس قسم کے اشعار عام ہوگئے کہ

یا خالق الاشیاء فی نفسہ انت لما تخلقہ جامع

تخلق ما ینتھی کونہ فیک فانت الضیق الواسع

" اے چیزوں کے پیدا کرنے والے تو اپنی ذات میں ان تمام اشیاء کا جامع ہے جو تو نے پیدا کی ہیں۔ جو کچھ تو نے پیدا کیا اس کی انتہا بھی تو ہے اس لئے تو تنگ بھی ہے اور وسیع تر بھی۔

وحدۃ الشہود کے حامی کہتے تھے کہ

جلت فی تجلیھا الوجود لناظری ففی کل مرئی اراھا برؤیتی

" اس کی تجلیات میں وجود میری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوا اور میں ہر منظر میں اسے اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں "

اس قسم کے خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کی مشیت میں عصیان و طاعت سبھی برابر ہیں۔ چنانچہ امام صاحب نے ان خیالات کو لوگوں کے ذہنوں سے ختم کرنے کے لئے نہایت موثر اور صحیح طریقۂ کار منتخب فرمایا، آپ نے اپنی تصانیف میں سب سے پہلے ان خیالات کے ماخذ بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد محققانہ انداز میں ان سے پیدا ہونے والے غلط خیالات کی نشاندہی کی ہے جو اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں پھر قرآن و سنت اور علمائے امت کے اجماع کی روشنی میں اسلامی عقائد کی وضاحت اور مروجہ باطل خیالات کی تردید فرمائی ہے۔

اسی زمانے میں متصوفین کے علاوہ متکلمین بھی عقائد کی بحثوں میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ جہم بن صفوان نے جبر و قدر اور دوسرے مسائل کو خراسان اور دیگر بلاد اسلامیہ میں خوب پھیلایا تھا اس نے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ

۱۔ جنت و دوزخ فانی ہے۔ "خلود" یا ہمیشگی کسی چیز کو نہیں۔ مطلق بقا ناممکن ہے

۲۔ ایمان معرفت کا نام اور کفر جہل و نادانی کا نام ہے۔

۳۔ خدا کا علم و کلام دونوں حادث یعنی مخلوق ہیں۔

۴۔ خدا کو کسی ایسی صفت سے متصف نہیں کیا جاسکتا جس کا اطلاق حادث یعنی مخلوق اشیاء پر ہوتا ہو۔

۵۔ قیامت میں دیدار خداوندی نہ ہوگا۔

۶۔ انسان مجبور محض ہے۔

ان عقائد کے پیروؤں کو جبریہ یا جہمیہ کہا جاتا تھا۔ اس کے برعکس معتزلہ انسان کے مختار کل ہونے کے قائل تھے۔ جس کی وجہ سے (۱) توحید (۲) عدل (۳) وعدہ و وعید (۴) المنزلۃ بین المنزلتین (۵) اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر ان کے اپنے خاص معتقدات تھے۔ ماتریدی مکتب فکر نے بھی اشاعرہ سے چند مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ امام صاحب کی نظر میں متکلمین کے یہ لفظی اور فروعی اختلافات محض منطقی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کا نتیجہ ہیں ورنہ اسلامی عقائد و افکار قرآن و حدیث میں واضح طور پر

بیان کردیئے گئے ہیں۔ چنانچہ امام اشعری کے اس قول سے آپ پوری طرح متفق ہیں کہ

قولنا الذی بہ نقول ودیانتنا التی ندین بھا التمسک بکتاب اللہ وسنۃ نبینا صلی اللہ علیہ وسلم وما روی عن الصحابۃ والتابعین وائمۃ الحدیث۔

" یعنی جس عقیدہ کے ہم قائل اور جس مسلک پر گامزن ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی حدیث کو مضبوط پکڑا جائے صحابہ وتابعین اور ائمہ حدیث سے جو مروی ہے اس پر ہی اعتماد کیا جائے۔" (الابانہ)

اس اصول پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے کہ امام صاحب عقائد میں منطق وفلسفہ کی مدد لینا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی عقائد سنت اللہ اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ انہیں منطقی قضیوں پر نہ پرکھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

" منطق وفلسفہ کے جو لوگ علمبردار ہیں، سب سے زیادہ شک اور اضطراب فکر کے مریض بھی یہی لوگ ہیں۔ نیز علم کے لحاظ سے فرومایہ اور تحقیق کے اعتبار سے کمتر...... علوم صحیحہ میں منطق کو ٹھونس دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبارت طویل ہوجاتی ہے۔ اشارہ بعید ہوجاتا ہے یعنی جلدی معلوم ہونے والی بات بعید تر ہوجاتی ہے جو آسان ہوتا ہے وہ دشوار ہوجاتا ہے۔ الخ (نقض المنطق ص ۱۶۹)

تصنیفات

امام صاحب نے اپنے ان خیالات کو تقریر وتحریر دونوں ذریعوں سے پھیلایا آپ نے مختلف مضامین پر متعدد رسالے لکھے ہیں، جن میں عقائد اور علم کلام میں ۱۲۶ رسالے آپ سے منقول ہیں چند مشہور رسالے یہ ہیں۔

عقیدۃ الحمویۃ الکبری۔ قاعدۃ نافعۃ فی صفۃ الکلام۔ الفرقان بین الحق والبطلان۔ کتاب الاستقامہ (دو جلد) منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ (چار جلد) کتاب الایمان۔

مسئلۃ فی العقل والروح۔ جواب السوال عن العرش۔ رسالۃ القضاء القدر رسالۃ فی العدم واستطاعتہ۔ رسالۃ فی احتجاج الجھمیۃ والنصاری بالکلمۃ۔ فقہ اور فتاوی میں ۱۳۸ رسالے لکھے جن میں رسالہ مختصر الفتاوی المصریہ۔ شرح المحرر۔ شرح العمدۃ۔ مسئلۃ فی رویۃ الھلال مسائل وردت من زارع۔ رسالہ فی ذبائح اہل کتاب۔ مجموعۃ الفتاوی لشیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

اصول فقہ اور اس کے متعلقات میں ۲۸ رسالے لکھے جن میں رسالہ اتباع الرسول لصحیح العقول۔ مسودہ فی اصول الفقہ۔ قاعدۃ فی الاجتہاد والتقلید وفی الاسماء التی علق الشارع بہا من الاحکام۔ رسالہ فی شمول النصوص الاحکام۔ قاعدۃ فی لفظ الحقیقۃ والمجاز والبحث مع الآمدی جواب فی الاجماع وخبر المتواتر وغیرہ۔

تفسیر پر آپ کے ۱۰۲ رسالے منقول ہیں، جن میں مقدمۃ فی اصول التفسیر اقسام القرآن۔ امثال القرآن۔ التبیان فی نزول القرآن۔ فضائل القرآن مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن شریف کی مختلف سورتوں کی تفاسیر بھی آپ نے کی ہیں۔ اسی طرح حدیث کے بھی اہم رسائل لکھے۔

اربعون حدیثا۔ جواب عن جملۃ الاحادیث دائرۃ علی الالسنہ اجازۃ لاہل اصبہان۔ الکلام علی احادیث القصاص۔ الکلم الطیب عن اذکار النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ شرح الحدیث انما الاعمال بالنیات۔ شرح الحدیث لایرث المومن کافر۔

فلسفہ اور منطق کے مختلف مسائل پر بھی تنقید فرمائی چنانچہ ۱۷ رسالے ان کے نقد وجرح سے متعلق ہیں۔

الرد علی الفلاسفہ۔ نقض المنطق قاعدۃ فی الکلام علی الممکن کتاب ابطال قول الفلاسفۃ بقدم العالم۔ قاعدۃ فی الکلیات۔

کتاب فی الرد علی المنطق وغیرہ۔ رسائل اس کی بہترین مثال ہیں۔

اخلاق اور زہد و تصوف پر بھی بہت کچھ لکھا۔ ۸۷ رسالے ان عنوانات پر ہیں جن میں رسالہ فی علم الظاہر والباطن۔ مسئلۃ فی الفقر والتصوف۔ الصوفیہ والفقرا قاعدہ فی اثبات کرامات الاولیاء قاعدۃ فی الصبر والشکر۔ قاعدۃ فی العلم والحلم۔ قاعدۃ فی تزکیۃ النفوس۔ قاعدہ فی امراض القلوب وشفائہا۔ درجات الیقین قاعدۃ فی الاحسان۔ قاعدہ فی الاخلاص وتقدیرہ بالعقل۔

علاوہ ازیں مختلف مضامین میں ۴۵ رسالے اور ۷ مکاتیب اور ہیں۔ جن میں قاعدۃ فی ان الاعتقادات ھند فنو شر فی الاحکام۔ رسالہ لاھل التدمر الوصیۃ الکبری۔ رسالۃ فی الطبقات۔ خلاف الامۃ فی العبادات ومذھب اھل السنۃ والجماعۃ۔ رسالہ تکبیر الاحجار۔ وغیرہ آپ کے مشہور رسالے ہیں قاضی شمس الدین۔ الملک الناصر شاہ قبرص وغیرہ کے نام آپ کے خطوط بھی مشہور ہیں۔

اس طرح آپ نے تقریباً ۵۹۱ رسالے تصنیف فرمائے۔ جو مختلف مسلم ممالک سے مجموعوں کی صورت میں شائع ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان رسالوں کی ضخامت ۴۰ ہزار صفحات ہے اور اگر آپ کی زندگی پر انہیں تقسیم کیا جائے تو ان کی تصانیف کی اوسط ۴۰ صفحات روزانہ بنتی ہے۔ اسی سے ابن تیمیہ کے قلمی جہاد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ایک یہودی نے مسئلہ قدر پر ایک سوال کیا آپ نے اس کا جواب ۱۸۴ اشعار میں فی البدیہہ کہدیا۔ حافظہ چونکہ نہایت تیز تھا اس لئے جیل کے زمانہ میں جو رسالے لکھے ان کے حوالوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔

امام صاحب حق اور باطل کے معاملے میں حضرت علیؓ کے اس قول کے پیرو تھے کہ "حق کو لوگوں کے ذریعے مت پہچانو بلکہ حق کے ساتھ اہل حق پہچانے جاتے ہیں" فقہی لحاظ سے امام صاحب مسائل کا استنباط بتدریج قرآن۔ سنۃ۔ اجماع امت

قیاس (مشروط طور پر)، استصحاب۔ مصالح مرسل اور استحسان سے فرمانے قائل تھے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ کسی مسئلہ پر صرف تقلید پر ہی اکتفا درست نہیں۔ اس سلسلے میں انہیں امام احمد بن حنبل کا یہ قول بہت مرغوب تھا کہ

لا تقلدنی ولا تقلد مالکا ولا الشافعی ولا الثوری وتعلم کما تعلمنا

"تم نہ تو میری نہ ہی مالک اور شافعی اور ثوری کی کورانہ تقلید کرو۔ بلکہ تم بھی علم حاصل کرو جس طرح ہم نے کیا ہے۔"

یہی وجہ ہے ان کے نزدیک قرآن و حدیث ہی وہ مقیاس ہیں جن میں سے ہر قسم کے مسئلہ کا حل موجود ہے۔ احادیث کے سلسلہ میں امام صاحب رجال سے مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ کڑی جرح کے بعد اسے قبول کرنے کے قائل تھے۔ اسی طرح علمی اور اصولی باتوں میں قدماء کے قول کو صرف شخصی امتیاز سے مرعوب ہوکر اس وقت تک قبول کرنا بہتر خیال نہ فرماتے تھے۔ جب تک دلائل سے وہ چیز واضح نہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت امام شافعی کے اس قول کا حوالہ دیتے ہیں۔

"یعنی اگر تمہیں کوئی زیادہ صحیح دلیل مل جائے تو میری بات دیوار پر دے مارو۔"

اس طرح امام ابوحنیفہ کے اس قول کہ

ھذا رائی فمن جاء برائی خیر منہ فقبلہ

"یہ میری رائے ہے اگر اس سے بہتر کوئی رائے تمہیں مل جائے تو اسے قبول کرلو" کا حوالہ دیکر آپ فرماتے تھے کہ مقصود شخصی اتباع نہیں بلکہ شرعی اتباع ہے۔ اس لئے عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنہ میں سے موتی چنتا ہی رہے۔

چنانچہ اسی حریت فکر اور اجتہاد اور قسر بانیوں کے پیش نظر تاریخ اسلام میں آپ کا نام مصلحین کی صف میں صفحۂ اوّل پر لکھا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی آپ کی سوانح بیان کرنے وقت لکھا ہے کہ ایک مجدد و مصلح کے لئے تین بنیادی چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ وہ مذہبی امور، علمی دنیا، یا سیاسیات میں مفید انقلاب لایا ہو۔

۲- اس کے خیال و افکار تقلیدی نہ ہوں بلکہ اجتہادی ہوں۔

۳- اس نے اسلامی افکار و انقلاب کے لئے قربانی دی ہو اور صعوبتیں برداشت کی ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ

" تیسری شرط اگر ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابو حنیفہؒ، غزالیؒ۔ امام رازی اور شاہ ولی اللہ دہلوی اس دائرہ میں آتے ہیں۔ لیکن جو شخص ریفارمر (مصلح و مجدد) ہونے کا اصلی مصداق ہو سکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہیں"

حضرت شاہ ولی اللہ اپنے ایک محقق شاگرد مخدوم محمد معین الدین سندھی مصنف دراسات اللبیب کو ایک مکتوب میں علامہ ابن تیمیہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

انا قد تحققنا من حاله انه عالم لکتاب الله ومعانیه اللغویة والشرعیة وحافظ لسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم وآثار السلف عارف بمعانیها اللغویة والشرعیة استاذ فی النحو واللغة محرر لمذهب الحنابلة فروعه واصوله۔ فائق فی الذکاء ذولسان وبلاغة فی الذب عن عقیدة اهل السنة لم یوثر عنه فسق ولابدعة اللهم الا هذه الامور التی ضیق علیه لاجلها ولیس شیئ منها الا ومعه دلیله من الکتاب والسنة وآثار السلف فمثل هذا الشیخ العزیز الوجود فی العالم ومن یطیق ان یلحق شاؤه فی تحریره وتقریره والذین ضیقوا علیه ما بلغوا معشار ما آتاه الله وان کان تضیقه ذالك ناشأ عن الاجتهاد۔ الخ

" ہم نے ان (ابن تیمیہؒ) کے حالات کی خوب تحقیق کی ہے۔ وہ قرآن مجید کے عالم، حدیث رسولؐ کے حافظ، دونوں کے لغوی و شرعی معانی کے ماہر۔ آثار سلف کے عارف اور نحو و لغت کے استاد تھے۔ حنبلی مذہب کے اصولاً و فروعاً تنقیح

کنندہ محقق، ذہانت میں یکتا اہل سنت کی طرف سے دفاع کرنے میں بڑے تیز طرار اور فصیح و بلیغ۔ فسق و بدعت کی ان میں کوئی بات نہ تھی چند ایک مسئلوں میں خواہ مخواہ ان پر سختی کی گئی حالانکہ ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس میں ان کے پاس قرآن حدیث اور آثار سلف سے دلیل نہ ہو۔ نیز یہ کہ سختی کرنے والے کو کتنا بھی معذور سمجھ لیا جائے بہرحال علم میں شیخ کے عشر عشیر بھی نہ تھے تقریر و تحریر میں کسی کی ان تک رسائی نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی شخصیت نادر الوجود ہوتی ہے"

(مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی طبع احمدی دہلی ص۲۷)

امام ابن قیم الجوزیہ (۶۹۱ھ - ۷۵۱) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید اور مورخ کبیر علامہ ابن کثیر کے باعث فخر استاد تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طبیعت میں بہت جوش و خروش تھا وہ قدرتی طور پر نہایت جوشیلے مجاہد تھے ان کے برخلاف امام ابن القیم کی طبیعت میں سکون و اعتدال تھا۔ لہٰذا اس جوش و خروش اور اس کے برعکس سکون و اعتدال نے، اپنے حریفوں پر جداگانہ اور مختلف طریقوں سے اثر کیا۔ دونوں کے ماحول اور حالات میں بھی بہت بڑا فرق رہا چونکہ امام ابن تیمیہ نے سب سے پہلے گمراہ خیالات کے خلاف مخالفت کا علم بلند کیا تھا۔ اس لئے انہیں اس راہ میں بہت سی تکالیف و مصائب برداشت کرنے پڑے جس طرح مادی جنگ و جدال اپنے دور میں بہت تیز اور سخت ہوتا ہے، اس طرح فکر و خیالات کی جنگ بھی آغاز میں بہت شدید اور سخت ہوتی ہے کیونکہ برسر کار فریقین اس وقت اپنے ساز و سامان سے پوری طرح لیس ہوتے ہیں، اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ تیزی اور حدت کم ہوتی جاتی ہے۔ جب ابن القیم کا زمانہ آیا تو ان میں مذہبی جھگڑوں کی تیزی کم ہو گئی تھی اور ان کا دباؤ بھی کم ہو گیا تھا لہٰذا آپ مخالفانہ بحثوں میں نہایت پرسکون اور معتدل مزاج رہے، آپ مختلف علماء کے خیالات و افکار پر نہایت ٹھنڈے دل اور سکون کے ساتھ غور و فکر کر کے ان کا موازنہ کرتے تھے اور اگر وہ شریعت کے مطابق ہوتے تھے تو انہیں اختیار کرتے تھے، اگر وہ شریعت کے خلاف ہوتے تو انہیں رد کر دیتے تھے خواہ وہ مسائل علم الکلام سے متعلق ہوں، یا علم فقہ سے ان کا تعلق ہو۔

(حیات امام ابن القیم)

مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈہ (سندھ)

مولٰنا مفتی عبدالقادر صاحب لغاری

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سنہ ۱۳[illegible]ھ میں بھرچونڈی تحصیل اباوڑہ ضلع سکھر میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر کلمہ توحید پڑھا اور دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے، سنت ابراہیمی کی ادائیگی بھرچونڈی میں ہوئی جب وہاں سے رخصت ہوکر طلب علم کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت حافظ صاحب نے دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ "خدا کرے کسی پختہ استاد کو پائے۔" یہ دعا بارگاہ الٰہی میں مستجاب ہوگئی، مولانا صاحب دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے اور انہیں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب جیسے کامل استاد مل گئے اور تخمیناً تین سال کی قلیل مدت میں عربی علوم کی تحصیل سے فارغ ہوکر سنہ ۱۳۰۸ھ میں "بھرچونڈی" واپس تشریف لائے۔ لیکن مولانا صاحب کے آنے سے ایک ہفتہ پہلے حضرت حافظ صاحب وفات پاگئے، حافظ صاحب کے دو بڑے خلفاء مولانا غلام محمد دین پوری اور مولانا تاج محمود صاحب امروٹی بھرچونڈی میں موجود تھے۔

مولانا سندھی کو حضرت دین پوری نے اپنی بیعت میں لے کر طریقہ قادریہ میں داخل کیا اور حضرت امروٹی مزید تربیت کے لئے ان کو اپنے ساتھ گوٹھ امروٹ تحصیل گڑھی یاسین میں لے آئے مولانا سندھی کے لئے امروٹ میں ایک عربی مدرسہ کا بنیاد رکھا گیا اور اشاعتی کام کے لئے پریس بھی قائم کیا گیا۔

مولانا سندھی کو طلب علم کے دور سے ہی کتب بینی اور مطالعہ کا بیحد شغف اور شوق رہتا تھا، اسی اثناء میں عربی کی نصابی کتابوں کے علاوہ کئی دوسری علمی کتابیں دیکھ چکے تھے،